بندرابن کی کنج گلی میں

اشفاق احمد

بندرابن کی کنج گلی میں

اشفاق احمد کی وہ کہانی جس پر اُردو ادب کو فخر ہے

میں آپ کو افسانہ پھر بھی سناؤں گا۔ آج مجھے ایک راز افشا کرنے دیجئے۔ ایک راز جو پچیس برس سے میرے سینے میں کھٹک رہا ہے اور مجھے بے چین کئے دیتا ہے۔ شاید اس میں آپ کو اپنی دلچسپی کا کوئی سامان نظر نہ آئے لیکن میں کیا کروں، مجھے بھی تو دل سے ایک کھٹک نکال کر آرام سے زندگی بسر کرنے کی ضرورت ہے۔

جب میں نے انٹرنس کا امتحان پاس کر لیا تو چاچا نے کہا "کمیٹی کی نوکری کر لو۔ ساری برادری میں شان ہو جائے گی۔" مگر میں نہ مانا اور اسے بتائے بغیر کالج میں داخل ہو گیا۔ نمبر اچھے تھے پھر شکل و شباہت سے میں خاصا غریب دکھائی دیتا تھا۔ قمیض اور جوتوں نے چوہدروں نے میری سفارش کی اور میری فیس معاف ہو گئی۔ کتابوں کا خرچ چلانے کے لیے میں نے چاچے

ساتھ دریا کمانا شروع کر دیا اور مجھے دن بھر کی کمائی میں سے دو آنے بلاناغہ ملنے لگے۔ جس دن ہمارے اکھنڈ میں دو تین روہو بھی آ جاتے اس دن چاچا مجھے بنا مانگے چار آنے دے دیتا۔ پہلے پہل چاچا کی طرح ماں بھی میری پڑھائی کے خلاف تھی مگر جب اسے پتہ چلا کہ بی اے پاس کرنے کے بعد مجھے ڈگری کے ساتھ ساتھ ایک خوبصورت بنگلہ اور پیاری سی کار بھی مل جائے گی تو اس نے میری مخالفت چھوڑ دی اور میری لالٹین کی چمنی کو ہر روز اپنی اوڑھنی سے صاف کرنے لگی۔

مچھلیاں پکڑنے کے لیے میں رات گئے تک چاچا کا ساتھ نہ دے سکتا کیونکہ گھر آ کر مجھے پڑھنا ہوتا تھا۔ تین چار مرتبہ ناپا دریا میں پھینک کر جو کچھ بھی ہاتھ آتا میں اسے ٹوکری میں ڈال کر اپنی راہ لیتا۔ بابا فریدا کنارے پر حقے کی آگ بنا رہا ہوتا۔ مجھے چلنے کی تیاری میں مصروف پا کر بڑی محبت سے کہتا۔ ''نمدار یا دو کش کھینچتا جا، گونڈی کا تمباکو ہے۔ سورگ کے جھونٹے آئیں گے، بچوں، سورگ کے۔'' لیکن میں ناپا کندھے پر ڈال کر کہتا۔ ''بابا دیر ہو رہی ہے۔'' اور پھر تیزی سے قدم بڑھاتا راستہ ناپنے لگتا۔ پل کے نیچے چاچا اور اس کے ساتھی جریلا پانی میں ڈالے اندھا شکار کھیل رہے ہوتے اور پرے کنارے پر بابا کے حقے کے پھول دہک رہے ہوتے۔

ناپے کی لڑیوں سے سیسے کی گولیاں باندھتے ہوئے ماں یہ ضرور کہتی۔ ''تیرا چاچا تیرے سے چھوٹا ہوگا جب ہماری شادی ہوئی تھی۔ ہر روز اکیلا دریا کمانے جاتا تھا پر کیا مجال جو کبھی کوئی ٹوٹنے دی ہو۔ تو پڑھا لکھا ہے۔ پھر بھی جال کو اجڑا ہوا آلنا بنا لاتا ہے۔''

میں لکھتے لکھتے جواب دیتا۔ ''بول نہ، ماں۔ میں پڑھ رہا ہوں۔''

اور ماں خاموش ہو جاتی۔

چونکہ کالج میں ہر کوئی جانتا تھا کہ میں سچا اور مچھیرے کا لڑکا نمدارا ہوں اسی لیے مجھے اپنی غربت چھپانے کی چنداں ضرورت نہ ہوئی۔ میرا ہر ہم سبق بڑی خندہ پیشانی سے مجھے اپنی کتابیں پڑھنے کو دے دیا کرتا۔ دوپہر کا کھانا اکثر اوقات میں اپنے ان دوستوں کے ساتھ ڈائننگ روم میں کھایا کرتا جو ہوسٹل میں رہتے تھے۔ ان میں سے چند اتنے اچھے تھے کہ مجھ سے اس کھانے کی ''قیمت'' بھی لے لیا کرتے تھے مگر وہ بہت اتنی زیادہ نہ ہوتی تھی۔ مجھے ان کے لیے ایک آدھ جواب مضمون یا منطق کے دو چار سوالوں کا جواب لکھنا ہوتا تھا جو فوراً ہی لکھے جاتے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو کبھی بھی اپنے دوستوں سے جدا نہ سمجھا۔ پر ایک تمنا ایسی بھی تھی جو کمبخت پھلنے پھولنے میں نہ آتی تھی اور وہ تھی شرارتوں میں شرکت کی آرزو۔ ہوسٹل اور کالج میں تمام اجتماعی اور انفرادی شرارتیں میرے بنائے ہوئے پلان کے مطابق ہوتی تھیں۔ لیکن میں ان میں شرکت نہ کر سکتا تھا۔ ہر شرارت کے خاتمے پر جرمانے ہوا کرتے اور مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ ایک آدھ جرمانہ بھی برداشت کر سکوں۔

ہفتہ کی ایک شام جب میں نے ہوسٹل کے منچلے جوانوں کو رائے دی کہ آج آدھی رات کو پچھواڑے جو مالٹوں کا باغ ہے۔ اس پر چھاپہ مارو اور ایک مالٹا بھی شاخ پر نہ چھوڑو تو تجویز تو کثرت رائے سے پاس ہو گئی لیکن سب نے مجھے بھی شب خون میں شامل ہونے پر مجبور کیا۔ میں نے حسب عادت وہی عذر پیش کیا تو نثار نے اسے یہ کہہ کر بے معنی قرار دے دیا کہ وہ میری جگہ بڑے سے بڑا جرمانہ ادا کرنے کو تیار ہے۔ اس پر میں نے بھی حامی بھر لی۔

میں کہنے کو تو ہاں کہہ آیا مگر رات بھر یہی سوچتا رہا کہ اگر کالج سے نکالے جانے کا جرمانہ ہوا تو؟ اس رات ایک بھی مچھلی نہ پھنسی حالانکہ پانی پر تیرتے ہوئے تروندے بار بار غوطے مار کر اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ بہت سی مچھلیاں آس پاس گھوم رہی ہیں۔ جال ایک طرف پھینک کر میں بابا فریدے کے پاس جا بیٹھا اور حقے کے کش لینے لگا۔ اتنی دیر تک بابا مجھ سے پتہ نہیں کیسی کیسی باتیں کرتا رہا مگر ایک کا جواب بھی ٹھیک سے نہیں دیا۔ میں برابر مالٹوں کے باغ پر چھاپے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ آخر یہ فیصلہ کر کے اٹھا کہ چھاپہ مارا جائے۔

''لیکن چھاپہ مارا کس وقت جائے؟'' نثار نے پوچھا۔

''ایک بجے۔'' میں نے بیڑی سلگاتے ہوئے جواب دیا۔

ایک بج گیا اور ہم ایک ایک کر کے غسل خانے کے پائپ کے ذریعے ہوسٹل سے باہر نکل گئے۔ چاند نکلا ہوا تھا۔ روشنی تقریباً دن جیسی تھی مگر اس میں گرمی کی جگہ خنکی اور سختی کی جگہ نرمی تھی۔ میں نے ساری پارٹی کو باغ کی کچی دیوار کی اوٹ میں چھپنے کو کہا اور خود ایک اندازے دیوار پھاند کر باغ میں اتر گیا۔ چاروں گوشوں کا اچھی طرح سے جائزہ لینے کے بعد میں نے ایک مالٹا توڑ کر چکھنا بھی چاہا کہ سامنے سے ایک نسوانی آواز آئی۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں کون؟'' اس نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''میں جو ہوتا ہے۔''

''اچھا۔'' وہ اور آگے بڑھی اور بولی۔ ''یہاں کیا کرنے آئے ہو؟''

اب وہ میرے سامنے کھڑی تھی۔

''مالٹے توڑنے۔''

''بازار سے لے کر کیوں نہیں کھاتے۔ تمہارے باپ کا باغ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''بازار میں تو توڑے ہوئے ملتے ہیں اور یہاں...''

اس نے زمین سے مٹی کا ایک بڑا سا ڈھیلا اٹھا لیا اور سینہ تان کر بولی۔ ''لو توڑو مالٹے۔''

میں نے اس کے جواب میں جیب سے ایک بیڑی نکالی اور اسے دیا سلائی دکھا کر کہا۔ ''اچھا نہیں توڑتے۔'' اور جب میں واپس مڑا تو اس نے ڈھیلا زمین پر پھینک دیا۔ تھوڑی دیر بعد باغ میں غل مچا۔ سیٹیاں گونجیں۔ کتے بھونکے اور سارے پودے دس منٹ کے اندر اندر مالٹوں کے بوجھ سے آزاد ہو کر شاخوں کے سر اوپر اٹھا کر چاندنی کا نظارہ کرنے لگے۔ اس دوران میں مجھے کچی دیوار کے اس طرف اس لڑکی اور اس کے ماں باپ کی گالیاں اور کوسنے سنائی دیتے رہے۔ اس کے سوا وہ کر بھی کیا سکتے تھے۔

''ساٹھ پینسٹھ لڑکوں میں سے ایک آدھ کو تو چغلی کھانی ہی تھی۔ نذیر نے مجھے اس فتنہ کا سرغنہ قرار دے کر پرنسپل کو رات کے ڈاکے کا سارا احوال بتایا۔ میری پیشی ہوئی اور میں صاف مکر گیا بلکہ میں نے یہ بات ماننے سے بھی انکار کر دیا کہ پچھلی رات میں ہوسٹل میں تھا۔ پرنسپل نے ہوسٹل کے تمام لڑکوں کو اکٹھا کر کے مجھ سے کہا کہ اگر یہ ثابت ہو گیا کہ کل رات تم یہاں تھے تو تمہیں کالج سے نکال دیا جائے گا۔ ایک دفعہ جھوٹ بول لیا تھا۔ اب سچائی کی سرحدیں بہت دور معلوم ہوتی تھیں۔ ایسے لگتا تھا جیسے سچائی افق کے پاس رہتی اور میں جوں جوں اس کے قریب پہنچنے کی کوشش کروں گا وہ دور ہوتی جائے گی۔ اس

لیے ایک مرتبہ پھر جھوٹ بولنا پڑا۔

دوسرے دن پہلے پیریڈ میں چپڑاسی پرنسپل صاحب کا بلاوا لے کر آ گیا۔ دفتر کے سامنے ساری پارٹی جمع تھی۔ اندر باغ کا مالی اور اس کی لڑکی اونچے اونچے بول رہے تھے۔ ایک ایک کو اندر بلایا جاتا اور اس کی شناخت کروائی جاتی۔ میری باری آئی اور میں اندر داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر لڑکی کی آنکھیں خوشی سے ناچ اٹھیں۔ میں نے نگاہوں ہی نگاہوں میں ہاتھ باندھ کر کہا۔ مجھ پر رحم کرو۔ میں بھی تمہاری ہی طرح ایک نادار آدمی ہوں اور اگر تم نے مجھے پہچان لیا تو میری زندگی تباہ ہو جائے گی۔''

لڑکی کے باپ نے پوچھا۔ ''یہی ہے وہ لڑکا؟'' تو لڑکی نے ایک آنکھ میچ کر اور پیشانی پر بہت سی شکنیں ڈال کر کہا۔ ''یہ تو نہیں۔ وہ چکی جو کا تو لمبا پتلا سینک سلائی سا تھا۔''

میرے حلق میں ایک چھوٹی سی خاردار جھاڑی اگ پڑی۔ میں نے تشکر آمیز نظروں سے اسے دیکھا اور اپنے کیے پر ندامت کا اظہار کرنے لگا۔ اس نے بڑی بڑی آنکھیں کھولیں اور جیسے کہنے لگی۔ ''اس مرتبہ تو ہم نے تمہیں معاف کر دیا لیکن اگر پھر ایسی حرکت کرو گے تو یاد رکھنا۔''

ایف اے پاس کرنے کے بعد مجھے وظیفہ مل گیا اور مجھے بی اے کرنے کے لیے لاہور آنا پڑا۔ کالج کی فیس وغیرہ ادا کر کے کل چھ روپے بچتے۔ پانچ روپے مہینہ چاچا بھیج دیتا تھا۔ خرچ تو خیر کسی نہ کسی طرح چل ہی رہا تھا لیکن سوٹ سلوانے اور سینما دیکھنے کو پیسے نہ بچتے تھے اور اب یہاں وہ دوست بھی نہ تھے جو میری اعانت کرتے۔ چونکہ یہاں کسی کو میرا اصلی نام معلوم نہ تھا اور میں نادار صاحب کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اس لیے اور بھی مصیبت تھی۔ گرد و پیش نے مجھے اپنی مفلسی چھپانے اور بڑا بننے پر مجبور کر دیا تو میں نے دونوں باتوں کو اپنا لیا۔

شاہ عالمی کے باہر بانس کے ایک سوداگر میمن سیٹھ تھے۔ انہوں نے اردو خط و کتابت کے لیے مجھے پانچ روپیہ مہینہ پر نوکر رکھ لیا۔ شام کو ایک مرتبہ جانا ہوتا تھا اور چند خطوں کے جواب لکھنے پڑتے۔ پہلی تنخواہ پر گیارہ آنے کی ایک رنگ برنگی ریشمی ٹائی خریدی۔ ایک پرانا امریکن کوٹ لے کر اسے اپنے جسم پر فٹ کروایا اور تنخواہ ختم ہو گئی۔ تھوڑے دنوں بعد کالج میں ایک مباحثہ ہوا اور مجھے دس روپیہ نقد انعام ملا۔ اگلے مہینے کی تنخواہ چار روپے پہلے لے کر ایک پتلون بھی سلوائی۔ معزز آدمی تو بن گیا لیکن یہ خدشہ جان کا لاگو ہو گیا کہ کسی دن چاچا بڑ کنارے والی سفید دھوتی اور بغیر تسموں کے سیاہ بوٹ پہن کر کالج نہ آ جائے۔

آنرز کی کلاس تھی۔ پروفیسر ابھی آیا نہ تھا اور ہم مستطیل میز کے اردگرد بیٹھے گپیں مار رہے تھے کہ کانتا نے پوچھا۔ ''پھولوں میں سے اچھا پھول کون سا؟''

''گوبھی کا۔'' میں نے ایک دم جواب دیا۔

سریندر نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور کہا۔ ''بھئی ایسا غیر شاعرانہ جواب ادب کی کلاس میں۔''

کانتا نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے سب سے اچھی خوشبو والا پھول کون سا؟''

کلثوم نے کاپی سے نگاہ اٹھا کر بڑی متانت سے مجھے دیکھا اور پھر اپنی کاپی پر جھک گئی۔ اس کی آنکھوں میں صبح بنارس کی سی نرمی تھی اور اس کے بال برسات کی اندھیری رات کی طرح سیاہ تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں کو بے پروائی سے میز پر ڈالے پڑھ رہی تھی۔ انگلیاں بہت زیادہ لمبی نہ تھیں۔ جلد بہت زیادہ سفید نہ تھی۔ تم

میز پر رکھے ہوئے وہ ہاتھ حضرت مسیح کی صبا کی دو موٹی موٹی سلوٹیں معلوم ہوتے تھے۔ کلثوم اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ اچھی لگی تھی مگر اب کی بار وہ صرف اچھی ہی نہ لگی تھی بلکہ اپنے سے برتر بھی۔ میرا جی چاہا کہ ابن مریم کے دامن کو ایک بوسہ دے کر آنکھوں سے لگا لوں مگر کلاس روم میں اپنی عقیدت کا اظہار کرنے کی مجھے جرأت نہ ہوئی۔

میری عادت تھی کہ تقریباً ہر پیریڈ میں کلاس سے باہر جا کر آدھا سگریٹ یا سالم بیڑی پیتا اور پھر دانتوں پر رومال رگڑ کر اپنی جگہ آ بیٹھتا۔ ایسے ہی ایک دن میں برآمدے میں کھڑا سگریٹ پی رہا تھا کہ کلثوم میرے پاس آ کر بولی۔ ''آپ اتنے سگریٹ کیوں پیتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''اس لیے کہ میرے پاس اتنے سگریٹ ہوتے ہیں اور اس لیے کہ فالتو سگریٹ بینک میں جمع نہیں کرائے جا سکتے۔''

وہ ذرا مسکرائی اور کہنے لگی۔ ''سگریٹ نوشی سے تو پھیپھڑے کالے ہو جاتے ہیں اور۔''

میں نے کہا۔ ''ہوتے ہیں تو ہونے دو۔ انہیں کون دیکھنے جائے گا۔ شکر ہے کہ۔''

اس نے کہا۔ ''انگلیاں بھی تو کالی ہو جاتی ہیں۔''

''انگلیاں؟'' میں نے ہاتھ اٹھا کر اپنی انگلیاں دیکھیں۔ ''کالی تو خیر نہیں پیلی ضرور ہو جاتی ہیں۔''

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور لاپروائی سے لائبریری کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

وہ کسی امیر آدمی کی بیٹی تھی۔ عنابی رنگ کی بڑی سی کار میں آتی۔ شوفر اس کی کتابیں اٹھا کر کمرے تک پہنچانے آتا اور پلٹتے ہوئے ضرور سلام کرتا۔ اسے اپنے باپ کی دولت پر کچھ ایسا غرور نہ تھا۔ موٹر سے نکلتی تو کندھے سکوڑے ہوئے یوں گھٹی گھٹی چلتی جیسے کسی نے اس کے سر پر احسان کا پہاڑ دھر دیا ہو۔ سفید رنگ کی شلوار قمیص پہنے اور سر پر جارجٹ کا سبز دوپٹہ اوڑھے وہ اسی طرح آتی جاتی رہی۔ کالج کی کیاریوں میں وہ اسی طرح کھوئی کھوئی چلتی جیسے وہ بھول کر یہاں آ گئی ہو۔ دراصل اسے کہیں اور جانا ہو۔

اب میں نے اس کے سامنے سگریٹ پینے چھوڑ دیے تھے۔ جونہی وہ سامنے سے آتی دکھائی دیتی میں سگریٹ کو جلدی سے بجھا کر جیب میں ڈال لیتا اور دانتوں سے ناخن کاٹنے لگتا۔ وہ میرے قریب سے گزرتی اور مجھے دیکھ کر آگے بڑھ جاتی۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر مجھے یوں لگتا جیسے اونچے اونچے درختوں کے جھنڈ میں صاف و شفاف پانی کے تال کے نیچے طلسماتی چراغ جل رہے ہوں۔ شاید ابھی وہیں سے میرا سگریٹ روشن نہ رہ سکتا تھا!

ایک دن پتہ نہیں کیا ہوا کہ وہ نہ آئی اور میری حالت اس بن ڈبے جیسی ہو گئی جو دن بھر غوطے مارنے کے بعد بھی کوئی مچھلی نہ پکڑ سکے اور شام کو خالی ٹوکری لے کر اپنے ڈیرے چلا جائے۔ دوسرے دن اس نے بتایا کہ وہ اپنی ایک عزیزہ کی شادی میں اس درجہ مصروف رہی کہ کالج نہ آ سکی۔ میں نے کہا۔ ''اگر نہیں آنا تھا تو کم از کم مجھے ہی بتا دیا ہوتا تاکہ میں بھی نہ آتا۔''

اس نے حیران ہو کر میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''میں تو کل بھی نہ آ سکوں گی۔''

میں نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور دوسرے دن کالج نہ گیا۔ اس سے اگلے دن مجھے پتہ چلا کہ وہ کالج آئی تھی۔ مگر ایک پیریڈ پڑھ کر چلی گئی۔

خاموشی کے ساتھ ساتھ اس کی محبت میں ڈر کا عنصر بھی تھا۔ پتہ بھی کھڑکتا تو کانپ اٹھتی۔ ہوا کے

جھونکے سے فرش پر کاغذ کا پرزہ سرسراتا تو وہ ٹھٹک جاتی اور اگر کمرے کا دروازہ دھڑ سے بند ہوتا تو وہ اپنی نشست پر اچھل پڑتی۔ خوف سے اس کے چہرے پر کئی رنگ آتے اور کروٹیں بدل بدل کر چھپ جاتے۔ اس کی وہی آنکھیں سیپوں کی طرح کھلا جاتیں اور اس کی سانس ذرا تیز ہو جاتی۔ میں نے اس سے کئی مرتبہ اس بارے میں پوچھا بھی مگر وہ کوئی معقول جواب نہ دے سکی۔ بس یہی کہتی رہی کہ میں شروع ہی سے ڈرپوک ہوں۔

گھنٹی بج جاتی اور کوئی پروفیسر دیر تک نہ آتا تو کلثوم کہتی۔ ''پروفیسر صاحب ابھی تک نہیں آئے۔''

تو میں فوراً کہہ اٹھتا۔ ''وہ تو فوت ہو گئے۔''

سب ہنس پڑتے اور اس کا چہرہ خوف سے زرد ہو جاتا۔

اس نے مجھے کئی مرتبہ ٹوکا تھا کہ یہ لفظ استعمال نہ کیا کروں مگر مجھے تو یہ لفظ کہنا اور اس کے ٹوکنے میں مزہ آتا تھا۔ سر چندر کبھی غیر حاضر نہ ہوا تھا مگر ایک دفعہ نہ جانے کیا ہوا کہ وہ پندرہ دن تک کالج نہ آیا اور جس دن وہ آیا تو میں نے اسے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ کر کہا۔ ''ہم تو سمجھے تھے کہ جناب فوت ہو گئے مگر آپ تو چلے آ رہے ہیں۔'' تو کلثوم نے کہا۔ ''یہ بڑی زیادتی ہے۔ آپ سے کئی مرتبہ کہا ہے کہ یوں نہ کہا کریں۔ آپ کو ڈر نہیں لگتا ایسی باتیں کرتے؟''

میں نے ہنس کر جواب دیا۔ ''نہیں۔''

ایک دن اس کی کار اسے لینے نہ آئی اور وہ دیر تک اس کا انتظار کرتی رہی۔ میں نے کہا۔ ''آج تانگے پر ہی چلو۔ آخر غریب تانگے والے بھی تو آپ ایسے دھن بانوں سے آس لگائے گھوڑے جوتے پھرتے ہیں۔'' اس نے میری بات مان لی اور ہم آہستہ آہستہ سڑک کے کنارے چلنے لگے۔ راستے میں اس نے ایک دو مرتبہ مجھے بڑے غور سے دیکھا۔ آج اس کی آنکھوں میں عجیب طرح کی چمک تھی۔ وہی چمک جو صدیوں زمین کا پسینہ چاٹ چاٹ کر کوئلے میں پیدا ہو جاتی ہے۔ آخری مرتبہ اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ ''مجھ سے رہا نہیں جاتا۔''

''کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ برا مان جائیں گے۔'' اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

میں نے کہا۔ ''اگر برا ماننے کی بات ہوئی تو ضرور مان جاؤں گا۔''

''میں نہیں کہتی۔'' اس نے سر ہلا کر کہا۔

میں نے کہا۔ ''اچھا نہیں مانوں گا۔''

اس نے کہنا شروع کیا۔ ''میں چھوٹی سی تھی تو ہمارے قصبے میں بیساکھی کے میلے پر ایک دفعہ سرکس بھی آیا۔ سرکس والے رات کو اپنے کرتب دکھاتے اور دن کو ایک چھوٹے سے خیمے میں اپنے جانوروں کے پنجرے جمع کر کے چڑیا گھر بنا لیتے۔ جنہیں دیکھنے کا ٹکٹ ایک آنہ ہوتا تھا۔ ابا جان مجھے بھی اس کی سیر کے لیے لے گئے۔ اس میں شیر تھے، بندر تھے، بڑے بڑے اژدہے اور چھوٹے چھوٹے نیولے تھے۔ ایک پنجرے میں پلوں جتنی منی منی گائیں تھیں اور ان کے ارد گرد لومڑیاں، بھیڑیے، لگڑ بگڑ اور گیدڑوں کے پنجرے بھی تھے۔ داخلے کے دروازے کے پاس ہی ایک بڑے سے بلے کا پنجرہ تھا۔ خیالے رنگ کا دھاری دار بلا گربلا! اور سارے جانور یا تو زور زور سے چیختے رہتے یا اپنے پنجوں سے پنجروں کے دروازے کھڑکاتے رہتے مگر وہ بلا پیال کے بستر پر آرام سے پڑا سویا کرتا۔ مجھے یاد ہے اس کے ناک کی پھننگ ہلکے گلابی رنگ کی تھی اور ہمیشہ تر

آلودہ رہا کرتی۔ کبھی کبھار وہ انگڑائی لے کر اٹھتا سارے بدن کو تانتا اور پھر اپنی پوستین جھٹک کر کونے میں پڑا ہوا گوشت کھانے لگتا۔ اس کے بعد اپنے پنجرے میں چکر کاٹنے لگتا۔ اس کی شکل وشباہت بڑی متین اور سنجیدہ قسم کی تھی۔ اس کے جسم کی دھاریاں ایک دوسری پر پلٹی رہتی تھیں اور اس کی دم بڑی سستی سے اس کے جسم کا ساتھ دیتی۔ چڑیا گھر ہمارے بنگلے سے کچھ ایسا دور نہ تھا۔ میں امی جان کی تلے دانی سے چپکے سے ایک آنہ نکالتی اور وہاں پہنچ جاتی۔ کسی دوسرے جانور کی طرف توجہ دیئے بغیر اس کے پنجرے کے سامنے جا کھڑی ہوتی اور دیر تک اسے دیکھتی رہتی۔ میرا جی چاہتا کہ ایک پتلی سی سینک سے اس کی ناک چھوؤں تا کہ اسے ایک پیاری سی چھینک آ جائے لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا۔ مجھے وہ اچھا بھی لگتا تھا اور اس سے خوف بھی آتا تھا اور

اور اتنے برسوں کے بعد میں پھر جیسے اپنے بچپن میں پہنچ گئی ہوں۔ آپ مجھے وہی باگڑ بلے دکھائی دیتے ہیں۔ اچھے سے اچھے سے۔'' وہ میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے اپنے چہرے پر غصے کے بناوٹی آثار پیدا کر کے مصنوعی چھینک لی اور ہم دونوں ہنس پڑے۔

میں نے کہا۔ ''تم اپنی گفتگو میں پنجابی کے بہت سے الفاظ بولتی ہو کیا تمہیں ''

اس نے سر ذرا اونچا اٹھا کر کہا۔ ''مجھے اس زبان سے محبت ہے اور اسی کی بدولت میں اپنی ایک نہایت عزیز سہیلی سے ہاتھ بھی دھو بیٹھی ہوں۔ کونونٹ میں ہمیں انگریزی کے سوا کسی اور زبان میں بات کرنے کی اجازت نہ تھی لیکن میرا جی اپنی سہیلیوں کو اڑیے کہنے کو ترستا تھا۔ راحت نے مجھے اس بات کی اجازت دے رکھی تھی کہ میں اسے علیحدگی میں ''اڑیے راحت'' کہہ کر پکار سکوں۔ ایک مرتبہ کامن روم میں کیرم کھیلتے ہوئے راحت نے اپنی گوٹ ہاتھ سے پاکٹ میں ڈال لی۔ میں نے دیکھ لیا اور بگڑ کر کہا۔ ''جا اڑیے، ہم نہیں تیرے ساتھ کھیلتے۔ تو تو بے ایمانی کرتی ہے۔''

اس پر ساری لڑکیاں کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور راحت مجھ سے ناراض ہو گئی۔

میں نے کہا۔ ''تم مجھے اڑیا کہہ لیا کرو۔''

وہ یہ سن کر گھبرا سی گئی اور پھر اسی طرح گردن جھکا کر چلنے لگی۔

جب کلثوم دو ہفتے کی چھٹی ختم کر کے کراچی سے واپس آئی تو اس نے آتے ہی پوچھا۔ ''میں جو اتنے دن کالج نہیں آئی تو آپ نے کیا کیا؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کچھ تو کیا ہو گا؟''

''ہاں۔'' میں نے ذرا سوچ کر کہا۔ ''جب پروفیسر نے پوچھا تھا کہ کلثوم نہیں آئیں تو میں نے ہولے سے کہا تھا۔ وہ تو فوت ہو گئیں۔''

کلثوم نے کہا۔ ''اور اگر میں سچ مچ مر جاتی تو آپ کو افسوس ہوتا نا؟''

میں نے کہا۔ ''یہ تو ایک محاورہ ہے اور تم محاورے کو لغوی معنی پہنا رہی ہو۔ یہ ٹھیک نہیں۔''

اس نے نہ جانے کیوں برا مان کر کہا۔ ''آپ کے لیے تو میں کبھی کی مر چکی ہوں۔''

میں گھبرا گیا۔ میرے نزدیک فوت ہو جانا ایک اور بات ہے اور مر جانا کچھ اور۔ اس نے ان دونوں کو گڈمڈ کر دیا تھا حالانکہ دونوں میں بڑا فرق تھا۔

کراچی کی سیر کا تذکرہ کرتے ہوئے اس نے کہا۔ ''ایک دن ہم ہاکس بے گئے تھے۔ اس کے قریب ہی لنبازا ماہی گیروں کی ایک بستی ہے۔ مچھیرے بڑے

بڑے جال پانی میں ڈال کر اونچے اونچے گیت گاتے ہیں۔ ان کی عورتیں اپنی جھونپڑیوں کے آگے بیٹھ کر جالوں کی مرمت کیا کرتی ہیں۔ موتیوں ایسے دانتوں والی سیاہ فام خوبصورت لنبازنیں۔ میں نے ان کے بہت سے فوٹو اتارے۔ انہوں نے مجھے ناریل کے چھوں کی ٹوکریوں میں تازہ تازہ مچھلیاں تحفے کے طور پر دیں۔ ان میں بہت سی میری سہیلیاں بن گئیں مگر ہمارا ان کا کیا ساتھ! ان میں خلوص ہے۔ مروت ہے اور ہم! ہم!'' اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''لیکن آپ میں ایک طرح کا خلوص ہے۔ مروت کی باس ہے۔ وہی مروت جو صرف ان کے یہاں مل سکتی ہے۔''

میں سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور مجھے ایسا لگا جیسے وہ کہہ رہی ہو۔ آپ میں بھی مچھلی کی باس ہے۔ ویسی ہی باس جو لنبازنوں سے آیا کرتی ہے۔ دل کے چور نے کہا۔ اسے پتہ لگ گیا کہ تم سجاول مچھیرے کے لڑکے نمدارا ہو۔ میرے گلے میں مچھلی کا کانٹا اٹک گیا اور میں نگاہیں زمین پر گاڑ کر اپنے جوتے کو آہستہ آہستہ فرش پر گھسنے لگا تا کہ اس کی بہت سی باتیں سمجھ میں نہ آ سکیں۔

کلثوم کہہ رہی تھی۔ ''میرا کوئی ساتھی نہیں۔ ہمارے خاندان میں بہت سے آدمی ہیں مگر سارے کے سارے تاجر ہیں۔ ان کے یہاں ہر قسم کا سودا ہے لیکن لطیف جذبات کی کمی ہے۔ کوئی ایسا ذہن نہیں جو میرا ساتھ دے سکے۔ کسی میں اتنی سکت نہیں کہ میرے ساتھ مل کر میری سکیم چلا سکے۔ لیکن میں کیا! میں تو خود ان کے ساتھ اسی دھارے میں بڑی تیزی سے بہے جا رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے میرا مستقبل کیا ہو گا۔ مجھے اس دن کا غم ہے جب میری تعلیم کسی کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔ میں تو اس دن کا انتظار کر رہی ہوں۔ شوق سے، ہاں! بڑی شدت سے۔''

اسی طرح کے بے شمار فقرات دہراتی وہ وہاں سے چل دی۔ نہ میں نے ان باتوں کا کوئی جواب دیا نہ اس نے پلٹ کر پوچھا۔

جب سے وہ کراچی سے آئی تھی کچھ الجھی الجھی سی رہتی تھی۔ عجیب عجیب سوال پوچھتی تھی۔ کیسی کیسی سکیمیں بناتی تھی۔ اپنے تمام رشتہ داروں حتیٰ کہ امی اور ابا کے متعلق بھی پتہ نہیں کیا کیا کچھ کہہ جاتی۔ ادھوری ادھوری باتیں، ٹوٹے پھوٹے جملے اور مدھم مدھم سرگوشیاں!

میں اس سے ملتے ہوئے اب اس لیے کتراتا تھا کہ اس پر میری حقیقت کھلی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ہاکس بے کے مچھیروں کی تعریفوں سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میری خفت تاڑ رہی ہے۔ ورنہ اسے کیا پڑی تھی کہ ہر روز انہی کی باتیں کیا کرتی۔

ایک رات میں نے فیصلہ کر لیا کہ صبح جا کر اس سے صاف صاف کہہ دوں گا کہ میں سجاول ماہی گیر کا بیٹا ہوں اور میرا نام نمدارا ہے۔ میں خود بھی ناپا پھینک پھینک کر مچھلیاں پکڑتا رہا ہوں اور مجھے بھنا مچھلی سب سے زیادہ لذیذ لگتی ہے لیکن یہ فیصلہ میں نے اس وقت کیا تھا۔ جب میں ماں کے تنور سے ایک آنہ کی دال روٹی کھا کر اپنی پھٹی ہوئی بنیان اور تہمد پہنے موج کی چارپائی پر چت لیٹا تھا مگر صبح جب مجھے اپنی ہستی کا اعتراف کرنا تھا تو میری کوزیاں ہائی نے اپنا پھن اٹھا کر کہا۔ ''اوں ہوں۔''

ادبی کتابوں سے منہ موڑ کر کلثوم اقتصادیات اور معاشیات کی اوندھی سیدھی کتابیں پڑھنے لگی۔ سارا دن لائبریری کی ایک ہی الماری سے چمٹی رہتی اور کاغذ کے پرزوں پر لمبی لمبی عبارتیں لکھ کر انہیں اپنے تھیلے میں ڈالتی رہتی۔ وہ ادب کی شاہراہ پر چلتے چلتے افادی الاقتصادی

بن گئی اور اس نے شیکسپیئر، ہارڈی اور کیٹس کو ایک دم بھلا دیا۔ یونیورسٹی لائبریری میں انگریزی ادب کی الماریوں کے پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ایک مرتبہ کہا۔ ''آپ کو پتہ ہے انفرادی جذبات کی ترجمانی کرنے والا سارا ادب

''فوت ہو جائے گا۔'' میں نے بات کاٹ کر کہا۔

''ہاں۔'' وہ ہنس پڑی۔ اس کی نگاہیں پکار پکار کر کہہ رہی تھیں۔ یہ نہایت ہی موزوں لفظ ہے۔

افادی اپنے خیالات میں دن بدن کٹر ہوتی چلی گئی اور وہ ادب سے کافی دور ہو گئی۔ ایک آدھ مرتبہ اس نے اشارتاً کہا بھی کہ وہ امتحان نہ دے سکے گی کیونکہ بہت سی انہونی باتوں کا جواب دینے کو جی نہیں چاہتا۔ مجھے اس کے اس رویے سے سخت شکایت تھی۔ دل چاہتا تھا کہ کسی دن چپکے سے لائبریری جا کر اس الماری کی کتابوں کے درمیان فاسفورس کا ایک قتلہ رکھ آؤں۔ لیکن پھر خیال آتا کہ اسے رنج ہوگا۔

یونیورسٹی لائبریری میں ایک دن اچانک مجھے ایک انگریز مصنف کے خطوط کی کتاب مل گئی۔ وہیں کھڑے کھڑے ایک دو خط پڑھے۔ یہ کتاب لائبریری میں 1927ء سے پڑی تھی۔ مگر ایک مرتبہ بھی ایشو نہ ہوئی تھی۔ میں وہ کتاب لے کر آ گیا اور رات گئے تک پڑھتا رہا۔ بڑے جذباتی خطوط تھے۔ سیدھی سادی زبان میں پیاری پیاری باتیں لکھی تھیں۔ پہلا خط کچھ اس طرح شروع ہوتا تھا:

جانِ تمنا!

جاننا چاہتی ہو کہ تمہارے چلے جانے کے بعد مجھ پر کیا بیتی۔ مجھ سے پوچھتی ہو کہ پہاڑ کے دامن میں کسانوں کے ننھے ننھے جھونپڑے مجھے اب بھی ویسے ہی حسین نظر آتے ہیں اور وادی میں گلاب اور یاسمین کی نکہت اب بھی ویسی ہی طرب انگیز ہے۔ جب تم یہاں تھیں؟ افسوس! ہر چیز نے اپنا لطف اور انداز بدل دیا ہے۔ جب سے تم نے اس وادی کو چھوڑا ہے میں صاحبِ فراش ہوں۔ آج جونہی میں کھانے کی میز پر بیٹھا میرا دل اندر ہی اندر ڈوب گیا۔ تمہارا کالی، ایک چھری، ایک کانٹا اور پانی کا ایک گلاس۔ میں نے دکھی دل سے اس کرسی کی طرف دیکھا جس پر تم بیٹھا کرتی تھیں۔ اسے خالی دیکھ کر میرا جی بھر آیا اور میں نے چھری اور کانٹا میز پر ڈال دیے اور اسی رومال سے منہ ڈھانپ لیا۔ مجھ سے پوچھتی ہو کہ مجھے وادی کی بہاریں اب کیسی لگتی ہیں

دوسرے دن پروفیسر کے آنے سے ذرا پہلے میں نے وہ کتاب کھول کر افادی کے سامنے رکھ دی۔ اس نے ورق الٹ کر مصنف کا نام دیکھا اور پڑھنے لگی لیکن پروفیسر آ گیا اور اسے کتاب بند کر دینا پڑی۔ لیکچر کے دوران میں اس نے کئی مرتبہ انکھیوں سے میری طرف دیکھا اور کتاب کی جلد پر انگلی سے کچھ لکھتی رہی۔ پروفیسر کوئی باریک نکتہ بیان کرنے لگا۔ ہم سب اس کی طرف متوجہ ہوئے اور افادی نے بھی گردن ذرا سی نیچی کر کے پروفیسر کو دیکھنا شروع کیا۔ بے خیالی میں اس نے کتاب کی جلد کو چھوا اور اس کے کنارے پر اپنی ٹھوڑی رکھ دی۔ پھر اس کی ٹھوڑی ذرا پھسلی اور اس کے کنارے پر اس کے لب پہنچ گئے۔ ایک دو مرتبہ اس کے لب آہستہ آہستہ ہلے اور پھر اس کے سفید دانت اس کنارے پر ٹک گئے اور دیر تک ٹکے رہے۔ مجھے ایسے لگا جیسے یسوع اپنے مہمانوں کے پاؤں دھو کر انہیں بوسہ دے رہا ہے۔

جاتے ہوئے وہ کتاب اپنے ساتھ لے گئی اور دوسرے دن جب وہ کتاب میرے پاس پہنچی تو اس پر

جابجا نشان لگے تھے اور اس کی جلد کے ایک کونے پر ارغوانی رنگ کا ایک چھوٹا سا بوسہ چپکا ہوا تھا۔ افادی نے اس کتاب کے بارے میں مجھ سے کچھ نہ کہا اور نہ میں نے پوچھا۔

اگلے دن میں نے لائبریرین کو بتایا کہ وہ کتاب گم ہو گئی ہے اور مجھ سے اس کی قیمت لے لی جائے۔ دیر تک پرانے پرانے رجسٹر دیکھنے کے بعد اس نے کہا کہ یوں تو اس کتاب کی قیمت دو روپے ہے لیکن نایاب ہونے کی وجہ سے ہم چودہ روپے چارج کریں گے۔ یکمشت چودہ روپے میں نے زندگی میں چند مرتبہ ہی دیکھے تھے۔ میں نے گڑگڑا کر مزید رعایت کے لیے کہا لیکن وہ اسی قیمت پر اڑا رہا۔ ہاں ایک رعایت اس نے ضرور دی کہ میں وہی کتاب بازار سے لے کر لائبریری میں داخل کروا دوں۔ چودہ روپے ملنے محال تھے اور کتاب دستیاب ہونی ناممکن تھی۔ میں نے اپنے سیٹھ سے روپے مانگے تو اس نے ضمانت طلب کی۔ جس کے پاس میں ڈیڑھ سال سے کام کر رہا تھا وہی آج مجھ سے ضمانت طلب کر رہا تھا۔ تین چار دن کے بعد میں نے وہ کتاب لائبریرین کو واپس کر دی کہ کتابوں کے انبار کے آ گئی تھی۔

جس طرح راؤ حاجندر اہن کے گلی کوچوں میں سے ہوتی ہوئی گنج گلی پہنچ کر شام کے دوارے آ کھڑی ہوئی تھی۔ اسی طرح میں لائبریری کی بڑی بڑی الماریوں کے پاس سے گزرتا ہوا سیدھا الماری کے سامنے جا کھڑا ہوتا اور وہی کتاب نکال کر دیر تک ارغوانی رنگ کے اس ننھے سے پھول کو دیکھ کر واپس آ جاتا۔

امتحان قریب آ گئے تھے اور میرے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جس سے کلثوم کی یادوابستہ ہو۔ دیوان غالب پر میں نے اپنا نام نہ لکھا تھا۔ سوچا اس پر اس کے آٹو گراف لے لوں گا اور شاعری اور افادیت کو ایک جگہ اکٹھا کر لوں گا۔ لیکن وہ نہ مانی اور یہ کہہ کر ٹال دیا کہ ''میں کوئی لیڈر نہیں، ادیب نہیں، مشہور ہستی نہیں۔ آٹو گراف کس لیے دوں۔'' اس پر میں اس سے ناراض ہو گیا اور اس سے بولنا بند کر دیا۔ اس نے کئی مرتبہ مجھے بلانے کی کوشش کی مگر میں بولا نہیں۔ ایک دن اس نے راستہ روک کر کہا۔ ''امتحان کے بعد روٹھ جانا۔ ابھی تو دو مہینے پڑے ہیں۔ اس کے بعد ساری زندگی روٹھے ہوئے ہی گزرے گی۔''

میں نے منہ تھتھا کر جواب دیا۔ ''میں امتحان سے پہلے ہی اپنے درمیان خلیجیں ڈال لینا چاہتا ہوں مجھے''

اس نے بات کاٹ کر کہا۔ ''خلیجیں بہت گہری ہوتی ہیں اور وہ پاٹی نہیں جا سکتیں اور جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے یہ وسیع ہوتی جاتی ہیں۔''

میں نے بڑی شان سے جواب دیا۔ ''ہوا کریں۔ انہیں پاٹتا ہی کون ہے۔''

امتحان قریب آتا جا رہا تھا اور وہ پڑھائی سے لاپروا ہوتی جا رہی تھی۔ کئی کئی دن تک کالج نہ آتی اور جب آتی تو ایک آدھ پیریڈ بعد چلی جاتی۔ سریندر نے ایک بار اس سے امتحان دینے کے ارادے کی بابت پوچھا تو اس نے مغلیہ شاہزادیوں کی طرح گردن اونچی کر کے کہا۔ ''ہم ضرور امتحان میں بیٹھیں گے!'' لیکن شاید اس کا ارادہ نہیں تھا۔

مسلسل ایک ہفتہ غائب رہنے کے بعد وہ اپنے نیلے رنگ کے تھیلے کو ہاتھ میں جھلاتی کالج گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ سرس کے درخت تلے شکستہ بنچ پر بیٹھے ہوئے میں نے ایک مرتبہ اسے دیکھا اور پھر کتاب پڑھنے لگا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے قریب آ کر

کھڑی ہوگئی اور زمین پر پڑے ہوئے ادھ جلے سگریٹ کو دیکھنے لگی۔ جو میں نے اسے ادھر آتے دیکھ کر پھینک دیا تھا۔ اپنا تھیلا کھول کر کلثوم نے اس میں جھانکا اور بولی۔ ''ہونہہ نہیں بولتے تو نہ سہی!'' اور اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈال کر گولڈ فلیک کا ایک ڈبہ نکال کر بنچ پر رکھ دیا۔ پھر جدھر سے آئی تھی ادھر ہی چل دی۔ میں نے ایک نظر ڈبے کو دیکھا اور پھر اسے دیکھنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں لٹکا ہوا تھیلا آگے پیچھے جھول جھول کر کہہ رہا تھا۔ ''پھیپھڑے کالے ہوتے ہیں۔ انگلیاں کالی ہوتی ہیں۔''

اس کے بعد وہ کالج آئی نہ اس نے امتحان دیا اور نہ کہیں ملی۔

بی اے آنرز کی فرسٹ کلاس ڈگری تو مل گئی مگر نوکری کہیں نہ ملی۔ وظیفے کے چھ روپے ختم ہو گئے اور لاہور میں گزران کرنی مصیبت بن گئی۔ ہر روز پانچ چھ عرضیاں ہاتھ سے لکھ کر یا ٹائپ کروا کر دستی یا بذریعہ ڈاک مختلف دفتروں میں پہنچا دیتا مگر یہ وہ دن تھے جب سال میں دو تین آسامیاں نکلتیں اور یونیورسٹی سے چار پانچ سو گریجویٹ۔ گولڈ فلیک کا وہ ڈبہ جو اتنا عرصہ سنبھال کر رکھا تھا آخر ایک دن کتا اور سگریٹیں ختم ہو گئیں۔ چاچا نے پھر خط لکھا کہ کمیٹی کی نوکری کر لوں۔

سیٹھ نے کہا۔ دس روپیہ مہینہ لے لو اور دن بھر کام کرو لیکن میں کم از کم تحصیلدار ہونا چاہتا تھا یا ایسی نوکری کی تلاش میں تھا جہاں ایک علیحدہ کمرہ میں میرا دفتر اور میرے گھنٹی بجاتے ہی جھپاک سے ایک چپڑاسی چق اٹھا کر اندر داخل ہوا کرے لیکن ایسا نہ ہوا۔ ایک دو دفتروں میں جگہیں خالی بھی تھیں۔ لیکن وہاں گھنٹیاں سن کر مجھے چق اٹھا کر اندر جانا تھا۔ میں نے ویسی نوکری سے انکار کر دیا۔

جب تحصیلدار، نائب تحصیلداری، صفعداری، آبکاری اور خودکشی سے تمام دروازے بند ہو گئے تو میں بغیر کسی کو اطلاع دیئے سندھ چلا گیا اور تال پوروں کی نوکری کر لی۔ ان کی زمینوں کی آمدنی کا جمع خرچ کر کے ہر روز بڑے سائیں کو ایک پرچہ بھیجنا پڑتا۔ اس کے صلہ میں مجھے دس روپیہ ماہوار ملتے اور دو وقت کا کھانا۔ تالپور دنیا بھر کی سب سے شریف قوم ہے۔ وہ شکار کھیلنے جاتے تو گاؤں کے کمیوں اور مزارعین کو ضرور ساتھ لے جاتے۔ جب وہ شکار مار کر لاتے تب بھی یہ لوگ ساتھ ہوتے اور جب شکار بھونا جاتا تو بھی اور جب وہ کھانے لگتے اس وقت بھی ہم ان کے گرد کھڑے ہوتے۔

بڑے سائیں اکثر کہا کرتے۔ ''منشی جی! سارا دن یونہی بیٹھے لکھتے رہتے ہو۔ کھیتوں پر جا کر مزارعوں کے ساتھ ہل ہی چلایا کرو۔''

میں ان کی بات سن کر مسکراتا اور یونہی بیٹھے لکھنا چھوڑ کر کھڑا ہو جاتا۔ کئی مرتبہ جی میں آئی کہ چاچا کو لکھ دوں کہ میں کہاں ہوں۔ لیکن پھر خیال آتا کہ ماں کو میری موت سے زیادہ مجھے بنگلہ اور کار نہ ملنے کا دکھ ہوگا۔ کسی اندھیری رات کو جب دھڑلے کی بارش ہوتی اور بجلی بار بار چمکتی تو مجھے خیال آتا کہ اس دانت کھاتی ڈائن ایسی رات میں چاچا بھور جال پھیر پھیر کر مچھلیاں تلاش کر رہا ہوگا اور وہاں کوٹھی میں جہاں ہم دونوں رہا کرتے تھے اس کے کونے میں کشتی چلانے کے ڈانڈ رکھے ہوں گے اور چولھے کے پاس گڑگڑ کا حقہ پڑا ہوگا۔ جس کی چلم چولھے کی راکھ میں اوندھی پڑی ہوگی۔ ماں ہر روز میری لالٹین صاف کر کے جلاتی ہوگی اور اس کے پاس ٹاپالے کر بیٹھ جاتی ہوگی۔ جس میں وہ سیسے کی گولیوں کی بجائے اپنے آنسو پروتی ہوگی۔ ایسی بارشوں نے مجھے بے چین کر

دیا۔ دریائے سندھ کے کنارے کی یہ دیہاتی زندگی مجھے شدت سے اپنا وطن یاد دلانے لگی اور میں نے تال پوروں کی نوکری چھوڑ دی۔

حیدر آباد کے اس ہسپتال میں مجھے نرس ہوئے ہوئے آج آٹھ سال ہوئے ہیں۔ نرسیں، قینچیاں، نشتر، سوئی، دھاگے، زخم، دوائیاں، مریض اور آہنی چارپائیاں میری زندگی کا جزو بن چکی تھیں۔ پر پتہ نہیں اس وقت میرا جی کیوں اس نوکری سے بھی بیزار ہو گیا ہے۔ کل رات سیاہ رنگ کی ایک خوبصورت سی کار وارڈ کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی۔ مریض کو سٹریچر پر ڈال کر پلنگ پر لٹایا گیا۔ سیٹھ گھبرایا ہوا تھا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کو بڑی بڑی رقموں کا لالچ دے کر مریض کو بچا لینے کی التجا کر رہا تھا۔ میں پرے کونے میں ہیٹر جلا کر سرنج ابال رہا تھا۔ میرے ساتھی نے قریب سے گزرتے ہوئے کہا۔ ''ایک اور مصیبت۔''

اپنے ایپرن کی ڈوریاں کستے ہوئے میں ڈاکٹر صاحب کو بلانے چلا۔ نئے مریض کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے اس مصیبت پر نگاہ ڈالی۔ وہاں کلثوم پڑی تھی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور بال کھلے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ ویسا ہی تھا ہونٹوں کی سرخی قائم تھی اور وہ بڑے اطمینان سے سو رہی تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے سیٹھ کا کندھا تھپتھپا کر کہا۔ ''گھبراؤ نہیں، سیٹھ بچ جائیں گا، بچ جائیں گا! یہ کوئی جاتی خطرناک بیماری نہیں۔ دورہ پڑا ہے۔ ٹھیک ہو جائیں گا۔''

''تو میں جاؤں؟'' سیٹھ نے پوچھا۔

''جاؤ! جاؤ۔'' ڈاکٹر نے آستین چڑھا کر کہا۔

''کب واپس آئیں گا؟''

''کل دوپہر کو۔'' سیٹھ نے سوچ کر کہا۔ ''کراچی سے گنم کا تار آیا ہے۔ ادھر ہمارے امپورٹ مال کا جھگڑا ہے۔ میں جاتے ہی کھلاس کراؤں گا۔''

سیٹھ چلا گیا تو ڈاکٹر صاحب نے انجکشن دے کر ٹیکا دیا اور مجھے مریض کے ہوش میں آنے کی رپورٹ کے لیے کہہ گئے۔

بارہ! ایک! دو! ڈھائی بجے میں اسٹول سے اٹھا اور اس کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ آہستہ سے کلثوم کا کندھا ہلا کر میں نے کہا۔ ''اقادی!'' مگر وہ بولی نہیں۔ دوسری مرتبہ میں نے ذرا زور سے پکارا۔ ''اقادی۔''

ہونٹوں کو ذرا سی جنبش ہوئی اور آنکھیں تھوڑی سی کھلیں۔ میں نے خوش ہو کر اسے پھر بلایا۔ اور وہ آنکھیں کھول کر خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اب ان آنکھوں میں صبح بنارس کی سی نرمی نہ تھی۔ وہ کچھ دھندلا سی گئی تھیں۔ میں نے اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیر کر ایک مرتبہ پھر پکارا۔ آنکھوں کو پھر جنبش ہوئی اور دریا کے کناروں پر چھائی ہوئی اس دھند کے پیچھے مجھے وہی باغ والی لڑکی نظر آئی جو ہولے ہولے کہہ رہی تھی۔ ''دیکھا ہم نے تمہیں پھر معاف کر دیا!''

کلثوم سب کے لیے مرگئی تو میرے لیے بھی ختم ہو گئی۔ میں یہ کہہ کر اپنے آپ کو دھوکا دینا نہیں چاہتا کہ وہ زندہ ہے یا وہ ازل سے میرے پاس تھی اور ابد تک رہے گی۔ وہ واقعی مر چکی ہے اور مجھ سے اتنی بڑی حقیقت جھٹلائی نہیں جاتی۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ کلثوم مرگئی ہے لیکن اس کا علم کسی کو نہیں کہ اقادی بھی ختم ہو گئی ہے۔ ہر شخص کو پتہ ہے کہ یونیورسٹی لائبریری کی کتابوں میں نیم کے سوکھے اور خستہ پتے ہوتے ہیں لیکن یہ کوئی نہیں جانتا کہ ایک کتاب کے ساتھ ایک سوکھا ہوا ارغوانی پھول بھی بندھا ہوا ہے۔